مسلم دانشوری کی روایت اور امام جعفر صادقؑ

م۔ر۔عابد

عرب میں ظہور اسلام کے قبل کے زمانہ کو عہد جاہلیت کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ عرب علم و ہنر سے یکسر عاری تھے۔ وہ نہ تو نرے انجان تھے اور نہ ہی گنوار تھے۔ ان کے تجارتی روابط دور دور کے ملکوں سے تھے۔ ان کی جہاز رانی ترقی یافتہ تھی۔ ان میں قیافہ شناسی بھی اونچے درجہ کی تھی۔ شعر و ادب کا بلند ذوق ان کے خمیر میں تھا۔ اکثر عورتیں اور بچے تک شعر میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی کا غزہ تھا کہ وہ اپنے کو 'عرب' (بولنے والا) اور دوسری قوموں اور ملکوں کو 'عجم' (گونگا) کہتے تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ مکہ معظّمہ جیسے ام القریٰ (Metropolis) میں پڑھنے لکھنے والے گنتی کے تھے۔ یعنی ان میں کتاب و قلم سے دلچسپی بہت کم تھی۔ اس طرح معاشرہ خاطر خواہ علم نوازی سے عاری اور علم کے 'باقیات الصالحات' سے بے بہرہ تھا۔ اسے ہم دانشوری (Intellectualism) کی روایت کا فقدان کہہ سکتے ہیں۔

اسلام کی پہلی وحی 'پڑھئے' 'قلم' کی اور 'مالم تعلم' (جو نہیں جانتا) والی حد تک تعلیم کی بات کرتی ہے۔ 'یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیَاتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ' والے اس کے رسول کا چار نکاتی منشور ہے: (۱) ربانی آیتوں (نشانیوں) کی تلاوت یعنی ترغیب علم (۲) تزکیہ (پاک کرنا) یعنی تحصیل علم کے لئے ضروری ڈسپلن (۳) کتاب کی تعلیم یعنی نظری (Theoretical) تعلیم (۴) حکمت کی تعلیم یعنی عملی وافادیتی (Practical & Applied) تعلیم۔

اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام 'قلم' کتاب اور حکمت کا مذہب ہے۔ یہ سب دانشوری کی نشانیاں ہی تو ہیں۔ یعنی اسلام دانشوری کا دین ہے۔

اسلام نے عرب معاشرہ میں جو پہلا اور سب سے بڑا انقلاب پیدا کیا، وہ اسی دانشوری کی روایت کو بونا اور اس کی فصل اُگانا تھا۔ رسولؐ اسلام کی سیرت اسی دانشوری کے قیام اور استحکام کو وقف رہی۔ اسلام کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اندھے اعتقاد (Blind Faith/अन्धविश्वास) کی زمین پر احمقانہ رقص کا حامی نہیں۔ اس کی گفتگو علم کی ہے، اور عقل سے ہے۔

رسولؐ اسلام نے دانشوری کی جو روایت قائم کی اس کو بچانے اور آگے بڑھانے کا کام امیر المومنینؑ کا تھا۔ مولاؑئے کائنات نے یہ کام اس خوبی اور طاقت سے انجام دیا کہ دانشوری آپ ہی کے نام ہو کر رہ گئی۔ تاریخ میں آپ کا نام علوم و معارف اسلامی کے شعبوں، حدیث، تفسیر، سیرت، عقائد واحکام اور ساتھ ساتھ عربی صرف و نحو (زبان و بیان) کے موجد و مروج کے طور پر آتا ہے۔

نہج البلاغہ ہی کو دیکھئے اس کا بڑا حصہ آپؑ کے خطبوں کی نذر ہے، اس کے بعد مکتوبات اور مقولے ہیں۔ خطبے بھی پہلے سے تیار کئے ہوئے مقالوں کی صورت میں نہیں ہیں

بلکہ اکثر وہ فی البدیہہ (tempore_Ex) ارشاد کئے گئے۔ ان کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ بات آسانی سے واضح ہوجاتی ہے کہ ان میں بڑی باقاعدگی ہے۔ ایسی باقاعدگی جو تحقیقی مقالوں اور علمی کتابوں کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ ایک قاری ان میں سائنسی فکر اور دانشورانہ نظر محسوس کرسکتا ہے۔ کچھ اسی نکتہ کی طرف دور حاضر کے ایک مشہور دانشور، عالم دین اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سید کلب صادق نے اشارہ کیا ہے۔ نہج البلاغہ پر ایک سیمنار میں (دو تین سال قبل) ایک مختصر لیکن پرمغز تقریر کے دوران کچھ یوں کہا تھا کہ دو کتابوں قرآن اور نہج البلاغہ کو عربی زبان وبیان اور سائنس کے خاطر خواہ علم کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔

حضرتؑ کے حکومت قبول کرنے کا ایک روشن فائدہ یہ ہوا کہ آپؑ کے ذریعہ دانشوری اور علوم وسائنس کی سرپرستی پر تاریخ نے اپنی مہر ثبت کردی، ورنہ ایک گوشہ نشین کے کارناموں کو، چاہے وہ جتنے اہم اور وقیع ہوں، دیکھ پانا ہی، اندھی چکا چوندھ کی ماری تاریخ کے لئے دشوار ہوتا ہے۔

سائنس کے مورخوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے آج کی ترقی یافتہ سائنس اور ٹکنالوجی کو یہ شکل دینے میں عربوں (یعنی مسلمانوں) کا بڑا اہم اور کلیدی رول ہے اور عربوں میں علوم وسائنس کی روایت کا سرا حضرت علیؑ کی اس سرپرستی اور قائدانہ شراکت تک پہنچتا ہے۔

یہ بھی مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا المیہ ہے کہ امیرالمومنینؑ کے بعد مسلمانوں کا تخت ملوکیت (شہنشاہیت) کو رہن چلا گیا۔ شہنشاہیت کی ازلی علم بیزادی اور دانشوری سے دائمی بغض ودشمنی پوشیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا اب تخت کی سرپرستی یا معمولی سی ہمت افزائی کی بھی غیر موجودگی میں دانشوری کی پیش رفت بظاہر سست ہوگئی۔ لیکن اب تک دانشوری جو پختگی اور جلالت پا چکی تھی، اس کے پیش نظر جلدی ختم ہونے والی نہیں تھی۔ حضرتؑ کے خاص دوستوں شاگردوں اور اہل خاندان کے رہتے دانشوری کے فنا ہونے کی توقع بھی بے جا ہے۔ تخت کی نظر میں یہ طبقہ کھٹک تو رہا تھا لیکن اس نے اپنی طاقتیں اس طبقہ کی سیاسی کمر توڑنے میں صرف کیں اور اس میں پلنے والی دانشوری کی طرف توجہ کرنے کا یا تو موقع نہیں ملا یا اسے ناقابل اعتنا سمجھا۔ اسی ماحول میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی گوشہ نشینی دانشوری کی زلفیں سنوارا کی۔ ان کے ہمنوا خاندان والے اور قریبی اصحاب میں خصوصاً اور ان کے زیر اثر مسلمانوں میں عموماً ایک محدود حلقہ بن چکا تھا جس نے دانشوری کی اس روایت کو نہ صرف فنا ہونے سے بچا لیا بلکہ حتی المقدور اس کی پیش رفت میں بھی کوشاں رہا۔ یہاں تک کہ کربلا آگئی۔

کربلا نے سماج پر جو پہلا بڑا، عام، دیرپا اور دوررس اثر مرتب کیا وہ یہ کہ حکمراں کی دینی حیثیت والی خلعت شاہانہ (عوام کی نظر میں) چھن گئی۔ اب تک حکمراں خلافتِ رسولؐ کے منظم دینی ادارہ کا از خود (Officio_Ex) صدر نشین (Chairman) ہوجایا کرتا تھا۔ کربلا نے اس صدارت یا Chair کو دربار سے آزاد کرا دیا۔ حکومت وقت مسلمانوں کے افعال وافکار پر سیاسی گرفت کے ساتھ جو دینی اقتدار بھی قائم کرچکی تھی اس سے وہ محروم ہوگئی۔ نتیجہ میں ایک بار پھر مسلمانوں کو اور مسلم دانشوری کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کربلا کے بعد اسلامی علوم

ومعارف کی تدوین وارتقا میں تیزی آ گئی جو کسی عینک یا دوربین کی مدد کے بغیر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

ادھر سیاسی منظرنامہ بھی تیزی سے بدلنے لگا۔ یزید کو تخت آبائی ترکہ کے طور پر ملا تھا۔ اپنے زوراقتدار کی پوری طاقت سے یزید کی اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف متشدد ومسلح کارروائیوں کے باوجود اسے اپنی نسل میں کوئی وارثِ (تخت) نہ مل سکا۔ کچھ تزلزل کے بعد یزید کے بنی اعمام تخت ہتھیانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن انھیں اطمینان سے اور سر اٹھا کے رہنا نصیب نہ ہوسکا۔ اب عوام وخواص تخت کے سلسلہ میں پوری طرح اور بڑے زور وشور سے خاندان رسالت کے حق میں ہوچکے تھے۔ حکومت مسلمانوں میں پہلی خاندانی سلطنت (Dynasty Rule) سے تو نکل گئی مگر ایک سیاسی جھٹکے سے ایک دوسری خاندانی سلطنت پیدا ہوگئی۔ خاندان رسالت کے منہ سے لقمہ اچکنے کی اپنی کہانی ہے، یہ سیاسی ستم ظریفی کی کھلی داستاں ہے۔ خاندان رسالت دینی برتری اور اصلاح امت کے آگے سیاسی مفادات کی قیمت 'جوتی' بھر بھی نہیں سمجھتا تھا اس لئے اسے اس کا کوئی غم بھی نہ ہوا۔ حضرت علیؑ کے وراثتی سلسلہ نے تو اپنے ہی خاندان کی طرف سے عدم تشدد سے ذرا سا بھی ہٹ کر احتجاج کی علانیہ یا مخفی زبانی یا اخلاقی ہمدردی بھی ظاہر نہ کی (حالانکہ بظاہر اصولی اختلاف بھی نہیں تھا)۔

ایک زوال آمادہ خاندانی حکومت کے بالآخر ختم ہونے اور دوسری خاندانی حکومت کے پیر جمانے کے درمیانی وقفہ نے بہرحال ایک سیاسی عدم استحکام کو جنم دیا۔ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا کر دانشوری کو اپنے کام کرنے میں بڑی سہولت ہاتھ آ گئی۔ مسلم دانشوری کا استحکام اور آگے کی پیش رفت اسی سیاسی عدم استحکام سے 'استفادہ' کی دین ہے۔

اس مذکورہ دور کی ابتداء میں امام زین العابدینؑ کی وقت شناسی اور سیاسی ودینی بصیرت نے ایک منفرد اور خاص، محفوظ ترین اور پوری طرح حماقت گریز Fool proof راستہ وا کیا۔ آپؑ نے پیغام کربلا کی تبلیغ وفروغ کی عصری ضرورت کے ضمن میں اپنا پیام دانشوری دعاؤں کی ابلاغی توانائی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح دانشوری کو ایک نیا اور اب تک کا 'کورا' / 'انچھوٹا' راستہ دے دیا۔ ؎

تو نے دعا کو یاس کے بن سے نکال کر
تو نے دعا کو نازِ طریقت میں ڈھال کر
تو نے دعا کو روح شریعت میں پال کر
تو نے دعا کو بول کے سانچے میں ڈال کر
لفظ 'دعا' کو شہرگ اظہار کردیا
ابلاغ حق کا قافلہ سالار کردیا
اے خالقِ خطابت ودلداریٔ دعا
اے موجدِ صحافت وگلکاریٔ دعا
اے شاعرِ عبارت وزنگاریٔ دعا
ہاں اے مدیر وقعت وضوباریٔ دعا
تجھ سے دعا کی طرفہ طلاقت چلی، سلام!
تو نے دعا کی خاص اشاعت رچی، سلام!

امام زین العابدینؑ کے وارث امام محمد باقرؑ کو وہ ماحول اور وقت مل گیا کہ قدرے سکون واطمینان سے علوم ومعارف کو ظاہر کریں۔ آپؑ نے علوم وحقائق سے اتنے اور اس طرح رازہائے سربستہ وا کئے کہ خاص وعام میں آپؑ

باقر العلوم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ لقب کسی خاص مسلک یا فرقہ یا کسی حلقۂ ارادت وعقیدت کا 'گھریلو' لقب نہیں ہے۔ بعد کی دانشوری کی بڑھتی روایت نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ امت مسلمہ پر امامؑ کا ایک اور بڑا تاریخی احسان ہے۔ آپؑ ہی کے مشورہ کے تحت ۷۵ھ/ ۹۵-۶۹۴ء میں مسلم مملکت میں پہلی مرتبہ اپنا سکہ رائج ہوا اور اسلامی ٹکسال قائم ہوا۔ سکہ سازی کا پورا خاکہ امام ہی کا بنایا ہوا تھا اور امام ہی کی نگرانی میں روبعمل ہوا۔ اس سے پہلے روم اور ایران کے سکہ ہی چلتے تھے۔ اس طرح امامؑ نے مسلم مملکت کو معاشی آزادی بخشی جو خود اپنے میں ایک بڑا دوررس دانشورانہ اقدام تھا۔

امام محمد باقرؑ کے بعد ان کے جانشین امام جعفر صادقؑ کو کچھ زیادہ ہی کھلی، آزاد اور باہری مداخلت سے مبرا فضا میسر ہوئی۔ امامؑ نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دانشوری کی روایت کو عام کیا اور بڑھایا، بہت بڑھایا، غیر معمولی انداز سے بڑھایا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امامؑ نے مسلم دانشوری کی روایت کو جوانی ورعنائی عطا کی۔

آپؑ سے قبل، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، دانشوری کی روایت تھی۔[۱] ارباب آگہی تھے، علم کی خیرات بانٹنے والے موجود تھے لیکن عوامی ذہن اس کی عام قبولیت کے لئے پوری طرح تیار نہ تھے۔ دانشوری کافی حد تک سمٹی ہوئی تھی۔ زمانے کے حالات خصوصاً علم وتعلم کی راہ میں سیاسی 'بے دلی' اور اداسی دانشوری کے نشرعام، فروغ اور وسیع قبولیت میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اب چونکہ سیاست خود اپنے میں محدود تھی، جوجھ رہی تھی، اپنی جانبری کی دعاؤں میں پڑی تھی، اس میں کم ازکم دانشوری کی راہ میں روڑا بننے کی سکت نہ رہ گئی تھی۔ اس طرح دانشوری کے پھلنے پھولنے کے لئے زمین پوری طرح ہموار تھی۔ امام جعفر صادقؑ نے اس زمین کو لالہ زار بنا دیا۔ آپؑ نے بڑی عظیم الشان بزم درس سجائی، جس کی مثال تاریخ میں شاید ہی ملے۔ پھر کیا تھا، علم وآگہی کے پیاسے پروانے بے تابانہ کھنچے چلے آئے۔ یہاں تک کہ ایک ایک وقت میں ہزاروں افراد آپ کی درس گاہ سے باقاعدہ استفادہ کرتے تھے۔ آپ کی مسند درس ایک کھلی یونیورسٹی کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ اس میں سماج کے مختلف طبقوں کے، مختلف سطحوں کے، مختلف مکاتب فکر کے حضرات بلاقید سن وسال، بلالحاظ مذہب ومسلک وملت شامل تھے۔ دانشوری کی صالح ترین روایت کے تحت یہاں ان کے لئے بھی جگہ تھی جو خود امامؑ سے دینی، مسلکی، فقہی، اصولی، نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ یہ درس گاہ مضامین وموضوعات کے لحاظ سے بھی بڑی متنوع ووسیع تھی۔ یہاں دینی[۲] لیبل والے علوم (جیسے تفسیر وحدیث، فقہ، علم الکلام وغیرہ جس میں کھینچ کھچا کے عربی زبان وادب کی بھی شمولیت ہے) ہی نہیں

[۱] اس ضمن میں جو نام اوپر آئے ہیں، وہ اتفاق سے ایک ہی نسبی سلسلہ کے ہیں۔ یہ کسی عصبی نظریہ کے تحت نہیں بلکہ علامتی طور سے ان کا مذکور ہوا ہے۔ بہر حال یہ نمایاں ترین نام ہیں جو دانشوری کے حوالہ سے بھی قائدانہ حیثیت اور سرپرستانہ منزلت کے مالک رہے ہیں۔

[۲] ناچیز اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود دینی ودنیوی زمروں میں علم کی تقسیم کا قائل نہیں ہے۔ مجھے کم ازکم اس سلسلہ میں دین ودنیا کے درمیان کوئی حد فاصل دکھائی نہیں پڑتی۔ اگر محض محرمات، ناجائز خواہشات اور بے جا ہوس رانی کی دنیا ہی کو دنیا کہیں تو بات دوسری ہے۔

فلسفہ، منطق، طبیعات، کیمیاء، نجوم وہیئت، مابعدالطبیعات، طب اور متعلقہ حیاتیاتی علوم، غرض کہ علم وسائنس کے سب ہی شعبے داخل تھے۔

اس یونیورسٹی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اکثر اصحاب وشاگرد قلم وکاغذ سے لیس رہتے اور امامؑ جو بھی ارشاد فرماتے فوراً قلمبند کرتے جاتے۔ اغلباً یہ کلاس نوٹس (notes_Class) کی پہلی کوشش تھی۔ انہی کلاس نوٹوں کی بنیاد پر آپ کے اصحاب وتلامذہ نے مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ ایک ایک نے تنہا سیکڑوں کتابیں جہان دانشوری کے حوالے کیں۔ ان میں چارسو اصحاب نے امامؑ کے فقہی استفساروں کے جوابوں پر مشتمل چارسو کتابیں مرتب کیں جو 'اصول اربعہ مائۃ' کے نام سے مشہور ہیں۔ آگے چل کر انہی کی بنیاد پر کتب اربعہٗ الکافی (ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینیؒ م ۳۲۹ھ/ ۴۱-۹۴۰ء) من لایحضرہ الفقیہ (ابوجعفر محمد بن علی بن موسیٰ بن بابویہ القمی الشہیر بہ شیخ صدوق م ۳۸۱ھ/ ۹۲-۹۹۱ء)، التہذیب اور الاستبصار (ابوجعفر محمد بن حسن بن علی الطوسی ''شیخ الطائفہ'' م ۴۶۰ھ/ ۶۸-۱۰۶۷ء) لکھی گئیں۔

اس یونیورسٹی کے اکثر شرکاء درس اپنے اپنے میدان میں برگزیدہ وسربراوردہ (جنہیں عرف عام میں امام کہا گیا، شیعہ امامیہ اصطلاح والا امام نہیں۔) ہوئے۔ ان میں امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی پیدائش ۸۰ء م ۱۵۰ھ/ ۶۸-۷۶۷ء اور امام مالک بن انس م ۱۷۹ھ/ ۹۶-۷۹۵ء بھی شامل ہیں۔ امام مالک کے شاگرد امام شافعی م ۲۰۴ھ/ ۲۰-۸۱۹ء تھے امام شافعی کے شاگرد امام احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی م ۲۴۱ھ/ ۵۶-۸۵۵ء تھے۔ یہ اصحاب علی الترتیب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے بانی ائمہ ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے تمام فقہی مسلکوں کے بانیوں کا سلسلہ تلمذ امام جعفر صادقؑ تک منتہی ہوتا ہے۔ شیعہ سیدھے امامؑ کی فقہ (فقہ جعفری) پر کاربند ہیں۔

امام کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ دانشوری کو ایک اور اچھوتا میدان ملا۔ حجلۂ درس میں تجربہ گاہ نصب کردی گئی۔ یعنی علم وحکمت (فلسفہ ومنطق) کے تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ تجربہ (Experimant) اور مشاہداتی تبصرہ کیا جانے لگا۔ نتیجہ میں یونان کا علم جو بیشتر نظری (Theoretical) تھا اور فلسفہ کی حد سے آگے نہ بڑھ پایا، اس میں تجربہ کا عنصر شامل کردیا گیا۔ اس طرح اس میں سائنس کی شکل ابھر آئی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور سب سے نمایاں کارنامہ امامؑ ہی کے ایک شاگرد ابوجعفر جابر حیان بن عبدالصمد الصوفی طرطوسی الکوفی (۷۴۲ء-۸۱۳ء) کا ہے جنھوں نے بڑی کارآمد انقلابی پہل کی۔ انھوں نے باقاعدہ تجربہ گاہ (Laboratory) تیار کی اور اس میں کئے گئے اپنے تجربوں کی مدد سے کیمیاگری (Alchemy) اور کیمیائی فلسفہ کو باضابطہ سائنس، علم کیمیا (Chemistry) بنادیا۔ اسی سبب انھیں بابائے کیمیا (Father of Chemistry) کہا گیا۔ جابر کے نام کا لاطینی املا Geber ہوا۔ (عربوں سے سائنس کا قافلہ کئی صدیاں پار کرکے لاطینی راہ سے یوروپ پہنچا۔) اسی نام سے وہ موجودہ سائنسی تاریخ میں معروف ہیں۔ انھوں نے کیمیا کے علاوہ طبیعات (Physics)، علم رویا (خواب سے متعلق) منطق (Logic)، طب (Medicine)،

سمیات (Toxicology) اور دوسرے علوم پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

دانشوری اور نشر علوم میں امامؑ کے قابل رشک کارناموں نے فضا میں وہ جلالت وتابانی گھول دی کہ کچھ ہی عرصہ بعد ہارون الرشید (عباسی خلیفہ۔ عہد: ۱۷۰ھ/ ۸۷-۷۸۶ء — ۱۹۴ھ/ ۱۰-۸۰۹ء) نے علوم وفنون کی سرپرستی میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ ہارون کے زمانہ نے علوم وفنون، سائنس اور ٹکنالوجی کی وہ ترقی دیکھی جو کسی دوسرے عباسی حکمراں کے پاعرب پایۂ تخت کے زیر سایہ (شائد) نصیب نہ ہوئی۔

امام کی دانشوری کے فروغ کے دیرپا اثر اور پذیرائی کی مثال جامعۂ ازہر، قاہرہ (مصر) بھی ہے جو دنیا کی موجودہ یونیورسٹیوں میں قدیم ترین (سب سے پہلے قائم ہونے والی) یونیورسٹی ہے۔ اسے مصر کے ایک فاطمی خلیفہ ابوعلی منصور حاکم بامراللہ بن عزیزباللہ (عہد: ۳۸۶ھ/ ۹۹۶ء — ۴۱۱ھ/ ۱۰۲۱ء) نے قائم کیا۔ وہ امامؑ کے صاحبزادہ اسمٰعیل کی نسل میں تھا اور خود اعلیٰ درجہ کا ہیئت داں (Astronomer) اور صاحب تصانیف تھا اور علوم وسائنس کی ترقی میں کوشاں رہا۔

آخر آخر امام جعفر صادقؑ کے دو ایک حکیمانہ مقولے، درج کر رخصت (تمت بالخیر) چاہوں گا۔ امام کے ان ارشادات سے آپؑ کے نکتہ نظر کو ایک حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ دانشوری کی پذیرائی اور فروغ عام کے بنیادی رہبر اصول معلوم ہوتے ہیں:

❁ علم حاصل کرو کیونکہ علم تمہارے اور اللہ کے درمیان ایک ایسا وسیلہ ہے جو دلوں کو خاشع کرتا ہے اور نیت میں اخلاص پیدا کرتا ہے۔ اور انسان علم کے حقائق کے بغیر اوہام، ہوا وہوس کو قبول کرتا ہے۔ اور اخلاص سے علم پاک اور اصیل ہوتا ہے۔

❁ سلطان لوگوں پر حاکم ہوتا ہے لیکن علم بادشاہوں پر حکومت کرتا ہے۔ جب تم میں خوف خدا پیدا ہوجائے تو سمجھو تم نے علم حاصل کیا ہے اور جب تمہیں علم پر فخر ہو تو سمجھو کہ تمہیں جہل نے آگھیرا ہے۔

❁ تین چیزوں خودنمائی، فخر ومباہات اور ریاکاری سے علم حاصل نہ کرو اور تحصیل علم کے لئے تین چیزیں، جہل میں رغبت، علم میں قناعت اور خجالت ترک کردو۔[۱]

(اعتراف واعتذار:۔ دانشور حضرات معاف فرمائیں، یہاں دانشوری کی ایک مسلّم روش یعنی مناسب اقتباسات، حوالہ اور ماخذات کی نشاندہی کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ احساس تو ہے، یہ ایک ناقابل معافی دانشورانہ جرم ہے۔ پر کیا کہوں، کیا کروں! سارے اقتباسوں، حوالوں اور ماخذوں کی تفصیل دینا دستیاب وسائل میں دشوار، دقت طلب، صبر آزما اور باعث طوالت وتاخیر ہے۔

دشواریٔ، دقت اور صبر تو دانشوری کو مطلوب بلکہ محبوب ہیں لیکن طول وتاخیر کی اجازت ''شعاع عمل'' کا وقتی تیور نہیں دے سکتا۔ تعمیل حکم میں جیسا کیسا ہوسکا حاضر ہے۔ آپ اسے ایساویسا ہی 'ناچیز' سمجھ کر درگذر فرمادیں، عین نوازش ہوگی۔)

❁❁❁

[۱] امام جعفر صادقؑ مولفہ المستشار عبدالحلیم الجندی ترجمہ زاہد علی ہندی ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء ص ۱۸۵